

لاہور آنے سے پہلے اسے جتنی خوشی تھی وہ یہاں آنے کے بعد دن بدن زائل ہوتی چلی گئی۔ وہاں اگرچہ وہ کچھ کچھ چزار اور وہاں کی لگی بندھی روٹین سے خائف رہتی تھی، لیکن لاہور آنے کے بعد تو جیسے نئی نئی فکروں اور پریشانیوں نے اس کی جان ہی پکڑ لی تھی۔ وہ صبح و شام انگلیوں پہ حساب کتاب جوڑتے جوڑتے ہلکان ہو جاتی۔ ابھی شام کو یونہی روزمرہ کی بات چیت میں اس نے سرسری سا ذکر ہی اس بات کا انصر کیا تو وہ چھوٹے ہی بولا۔

”صحیح کہتے ہیں سیانے عورت کو مطمئن رکھنا ناممکنات میں سے ہے وہاں تھیں تو اوھر کی زندگی سے

فاسقہ افشار

سچی سلطنت

بیزار، اب اپنے من چاہے شہر آئی ہو تو یہاں سے بھی شکایتیں۔

”میں کوئی عادتاً تو شکایت نہیں کر رہی انصر! بلکہ شکایت ہی نہیں کر رہی یونہی تذکرہ کر دیا کہ کتنا فرق پڑا ہے یہاں آنے سے۔“ وہ شرمندہ ہو گئی۔

”تو بھگتو اب خواہش بھی تو تمہاری ہی تھی نالاہور آ کے بسنے کی۔“ اس کی بات پہ وہ دیکھتی رہ گئی۔

”یہاں آنے میں میری کسی خواہش کا دخل نہیں، یہ آپ بھی جانتے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے، میں وہاں کی زندگی سے غیر مطمئن تھی لیکن پھر بھی گزارا کرتی رہی۔ یہ تو آپ کی ٹرانسفر بھی جولاہور لے آئی۔ میری خواہش یہ آنا ہو تا تو بہت پہلے ہی چلے آتے۔“ وہ محض

سوچ کے رہ گئی کہ شادی کے بعد تو گویا اس نے بھی لفظ شکوے کا ادا کرنا خود یہ حرام کر لیا تھا۔

”مرد کا ساتھ آسمان پہ نکلے سورج کی طرح ہے۔“

داؤد کے الفاظ آج بھی من و عن یادداشت محفوظ تھے۔ ”بیٹا! جس طرح سورج کی دھوپ کی موسم میں چھپتی ہے، جھلساتی ہے اور کسی راحت کا سبب بنتی ہے، کسی وقت اس کی کھال چھید دیتی ہیں اور کسی رت میں اس کی ہڈیوں تک میں سنگون پہنچا دیتی ہیں، اپنی گرم حرارت سے۔ اسی طرح مرد کے ساتھ میں

پیش ہے، ابھی ٹھنڈک، سورج کی روشنی کہیں کچھ پودے نکلے ہی ملتا جاتے ہوں مگر اپنی کوکھ ہری کرنے کے لیے کون کی ضرورت ہے۔ بنا مرد کے عورت کا ”عورت بن“ بھی ارم باٹا ہے۔ اپنی تکمیل کے لیے وہ مرد کی منتظر رہا ہے اس لیے بیٹا! کبھی کبھی کی گرمی برداشت کرنا سوچ کر کہ چاہے کتنی بھی آگ کیوں نہ برساتی سورج، کبھی کسی نے یہ خواہش بھی کی ہے کہ سورج نہ نکلے۔“

لیکن بی شستہ نے داؤد کی باتیں نصایت سما سنی تھیں اور ایک اچھی مشرقی بیٹی سے ایک بننے کے لیے خود کو ذہنی طور پر بالکل تیار کر لیا تھا۔

بڑے ٹھنڈے مزاج کا واقع ہوا تھا، تینوں بڑی مندیں بیابانی ہوئی تھیں اور دوسرے شہروں میں ہونے کی وجہ سے مہینوں میں چکر لگتے تھے۔ ساس شادی کے سات ماہ بعد ہی وفات پا گئیں۔ اس کے دلہنا پے کے دن ساس کی خدمت کرتے گزرے پھر بھلا وہ کیوں نہ اسے دعائیں دیتیں۔



شستہ لاہور جیسے بڑے شہر سے بیاہ کر گجرات گئی تھی۔ لاہور میں بھی کسی شادی کی تقریب میں اس کی سب سے بڑی مند نے اسے دیکھا اور بھائی کے لیے پسند کر لیا۔ امی، ابو کچھ متاثر تھے کہ لاہور میں پیدا ہوئی، پتی بڑھی، ہوم اکناکس کالج سے گریجویٹ اپنی انگوٹھی مٹی کو اس پسماندہ شہر میں کیسے بیچ دیں۔ دوسری طرف لڑکانہ صرف خوبو اور تعلیم یافتہ تھا بلکہ واپڈا میں اچھے عہدے پر بھی تھا۔ ابو کی چھان بین کے بعد اس کا ایماندار اور اصول پرست سرکاری افسر ہونا بھی ثابت ہو گیا جو ان کی پسلی ترجیح تھی۔ امی کے لیے بھرے پرے سسرال کا بکھیرنا نہ ہونے کا تصور خوش کن تھا۔ پھر دادو کے فیصلے پہ سب نے یہ سوچ کے رضامندی ظاہر کر دی کہ چھوٹے شہر میں رہنے کے باوجود سب بہن بھائی تعلیم یافتہ تھے، گھرانے میں شائستگی اور خاندانی وقار نظر آتا تھا، شستہ ایڈ جسٹ کر لی گئی۔ اسے بھی پہلے پہل ایڈ جسٹ کر لینا کوئی خاص دشوار نہ لگا۔ نئی نئی شادی کا شمار ہر دن ہی نیانیا سا لگتا اور پھر شادی کے ڈیڑھ ماہ بعد ہی انصر کے ٹرانسفر آرڈر آگئے۔

”مترانوالی؟ یہ کون سا شہر ہے؟“ وہ روہاسی ہو رہی تھی۔

”شہر نہیں، ترقی یافتہ قسم کا گاؤں ہے۔“

”گاؤں تو گاؤں ہی ہوتا ہے اس میں کیا ترقی یافتہ اور کیا ترقی پذیر، وہاں کیا کوئوں پہ ریموٹ کنٹرول ڈول لگے ہوتے ہیں۔“ اس کی جھلجھلپت پر انصر ہنس پڑا۔ ”میرا کہنے کا مطلب ہے وہ کوئی ایسا پسماندہ قسم کا

گاؤں نہیں جیسا کہ تم اس کے نام سے تصور کر رہی ہو، ٹیلی فون، گیس، بجلی سب سہولتیں ہیں گھر کے طرح کے محلے اور علاقے ہیں اور یوں بھی اور اماں کو تو وہاں رہنا نہیں کیونکہ یہاں اماں چل رہا ہے، وقت بے وقت طبیعت خراب، ہاں ڈاکٹر کے پاس لے جایا جاسکتا ہے اور تمہیں بھی ہے اماں کے ساتھ ہی رہنا ہو گا۔“ اس نے کہا مگر وہ اور ہر اسماں ہو گئی۔

”تو کیا میں آپ کے بغیر رہوں گی، آپ وہاں یہاں۔“

”میں آتا جا رہوں گا شستہ۔ جب پاور ہاؤس ہو جائے تو ہو سکتا ہے۔ میں واپس اپنے ہی شہر آؤں اور اگر باغیچہ وہاں اعیانہ ہو گیا تو پھر میری طبیعت ہے، پھر میں جناب ایک اچھی سی گاڑی اماں کے ہر روز اپنی ٹیکم کے ہاتھ کا کھانا کھاؤں گا۔“ اس شستہ کی انگلیاں لبوں سے لگائیں۔ حسب

دیکھ لیتے تو گھر گزرتا تھا، اس کے علاوہ ضرورت ہوئی، وہ خود وہاں آکر رہا کرتا۔

نے ان کا اپنی مومن پریڈ اور لمبا کر دیا تھا۔ وہ دونوں بھی شستہ بعد ایسے ملتے جیسے نئے نئے پر کی بڑے شستہ کے بعد مل پائے ہوں۔ جس شام انصر کو ہوتا، اس کا گھر گئے نہیں کھانا تھا، اس کے پاس کھانے بناتی، گھر کو منواتی، خود کو سجاتی۔ سارا

ساری رات ایک دوسرے کے ہاتھوں میں لپکتے ہوئے نظروں کی پیاس بجھائے نہ بجھتی۔ اس رو میں خلل آیا جب عرصہ سے گرووں کے عارضہ میں اماں جان وفات پا گئیں۔ سات ماہ کے دن رات ساتھ نے اماں سے اس کی وابستگی شدید کر دی تھی، ہوتا بھی کون تھا ساس، بہو کے ساتھ۔ وہ بلک بلک یوں روئی کہ اس کو سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ ابھی دن دن پہلے ڈاکٹر نے اسے ماں بننے کی خوشخبری سنائی، اس لیے طبیعت پہلے سے گری گری تھی کم کی تھی سے اور تڑھال ہو گئی تو انصر نے بہنوں کے مشورے

اپنی امی کے ساتھ لاہور جانے کی اجازت دی، پھر یہ قیام لمبا ہی ہوتا چلا گیا۔ اس کا دل کچھ امی نے انصر کو دھیرے سے سمجھایا کہ پہلی پہلی بار امی کو ماں بننے کے مرحلے میں کتنی احتیاط کی جانی چاہی۔

اماں نہ تو کوئی تجربہ کار خاتون ہے جو اس کا دھپان کر نہ ہی طبی سہولتیں ایسی ہیں کہ کسی ایمر جیسی دوری مدول سکے لڈا بیٹا اسے ڈیوری تک یہیں رہے۔ پھر تو اللہ رکھے خیر سے تمہیں سدا اکٹھے ہی رہنے ہر شے مل جایا کرو۔“

اس پید ہو اتویہ عذر مل گیا کہ اتنی منہمی سی جان کو امی کی اچان جگہ میں کیا سنبھال جائے گی۔

ار اپنے کو ہوش تو پکڑنے دو بیٹے، ابھی لے جانا خیر ہو گی کو۔ دیکھو تو ذرا کیا ننھا سا وجود ہے چرما کے

ساتھ اتنا کمزور اور نازک بچہ ہے کبھی کھانسی، کبھی کی خرابی، کبھی نزلہ، شستہ نے بھی بچے سنبھالے

ار سے چٹا بھی چلے کہ اب کس وقت بچے کو کیا ہے، کیا ضرورت محسوس ہو رہی ہے وہ تو ہر بار

کے رونے پہ فیڈر ہی منہ سے لگا دے گی ڈر اسے اناؤ سیکھ لینے دو۔“

اور یوں اپنا ہی بچہ پالنا سیکھنے میں اس نے مزید پانچ ماہ گزارے، اس کے بعد بھی امی کے پاس مشغول بہانا

اور وہ یہ کہ بچے کی پسلی سر دی سخت ہوتی ہے اور

علاقوں میں تو پلا پلا بھی کڑا ہے۔ مگر اس بار انصر

ایک نہ سنی اور اسے لے کر مترانوالی چلا آیا۔ پھر اس کے دو سال بعد انصر ہوئی اور اس کے اگلے ہی

انصر نے ان کی فیملی مکمل کر دی مگر کسی بھی ڈیوری لے انصر نے اسے لاہور نہ بھیجا، امی خود ہی وقت پہ

اور کچھ دن رہ کے چلی جاتیں۔ یہاں اس کے ایک فل ٹائم ملازمہ رکھ چھوڑی تھی انصر نے اور

رات کے وقت بھی کئی تجربہ کار عورتیں مل جاتیں، بعض معاوضے پر اور بعض تو رضا کارانہ طور پر ہی بچہ کی دیکھ بھال کرنے کا کام کرتیں۔ گجرات میں

گزرے چند مہینے تو پھر بھی اچھے گزر گئے تھے۔ ساس کی وجہ سے رشتہ داروں کا آنا جانا لگ رہا تھا۔ مندیں بھی ماں سے ماہ بہ ماہ ملنے چلی آتیں اور پھر انصر تھا جس سے ہفتے ہفتے بعد ملنے کی چاہ ان کی از دواجی زندگی کو ترو تازہ کیے رکھتی، مگر یہاں اس شہر میں جو نام کا ہی شہر تھا ورنہ ایک مکمل دیہات والی تمام خوبیاں اس میں پائی جاتی تھیں، وہ اپنا دل نگانے میں قلعی ناکام رہی تھی۔ پاور ہاؤس مکمل ہونے کے بعد انصر اسی امریا میں اعیانہ ہو گیا تھا بلکہ اس کا عہدہ بھی برہہ گیا تھا۔ گاؤں میں تو یوں بھی سرکاری افسروں کی بڑی عزت کی جاتی ہے۔ اتنے مہینوں تک کھداری کے خرچوں سے آزادو رہنے کے باعث انصر نے بچت کر کے ایک سیکنڈ ہینڈ سو زو کی ایف ایکس بھی خرید لی تھی۔ گاڑی جیسے جیسے اونچے نیچے رستوں سے گزرتا جاتی آگے بڑھتی رہی، اس کی مایوسی بڑھتی چلی گئی۔

بالکل گاؤں والی ہو چکی گئیں، مکان اگرچہ بکے تھے مگر بیشتر سینٹ اور روٹن سے محروم، کئی ایک پہ مین کی چھتیں۔ ہر گلی کے کونے پہ گدھے کی جسامت کے خوفناک کتے بدبو دار متعفن نالیاں، ان پہ بیٹھے آدھے تنگے بچے اور بچوں پہ جھنجھٹالی کھیاں اس نے اس کو سینے سے بچھینچ لیا۔ اس کی اڑی رنگت پر وہ مسکرا دیا۔

”یہ اندرونی مترانوالی ہے، قدیم محلہ۔ میں نے رہائش آفس کے قریب ہی رکھی ہے۔ وہ ہے تو اسی شہر کی حدود میں مگر نئی آبادی ہے۔ مکان بھی نئے تعمیر شدہ اور جدید سہولیات سے مزین ہیں۔ آس پاس اور بھی سرکاری افسران رہتے ہیں، کچھ یہاں کے مقامی لوگ بھی ہیں یوں سمجھ لو کہ وہ مترانوالی کے معمول علاقوں میں شمار ہوتا ہے جیسے لاہور میں ڈیفنس، کراچی میں کلکشن۔“ اور یوں وہ بچکولے کھاتی مترانوالی کے ”ڈیفنس“ پہنچی تھی۔

کئی پلاٹ خالی پڑے تھے، جن پہ قد آدم جھاڑاگ آیا تھا، گائے بھینسیں آزاوانہ چر رہی تھیں، سڑکیں کشادہ اور پکی تھیں۔ جتنے بھی مکان تھے سب ہی نئے

بنے ہوئے اور تقریباً ایک ہی ڈیزائن کے تھے۔ ایک قدر مشترک یہ بھی تھی کہ سب میں ہی ”پینڈوپن“ نمایاں تھا۔ غالباً یہاں ان لوگوں کی رہائش نسبتاً زیادہ تھی جن کے اہل خانہ میں سے کوئی دینی یا کویت تک پہنچ گیا تھا اور وہ پرانے محلے سے نئی آبادی اٹھ آئے تھے۔ مگر اپنا طرز رہائش وہ وہاں بھول کر نہیں آئے تھے، ساتھ ہی لے آئے تھے مکانوں کی تعمیر میں گہرے گہرے شوخ رنگوں کا استعمال وافر مقدار میں ہوا تھا۔ کئی نے تو چاند ستارے بیرونی دیواروں پہ سجا رکھے تھے، کئی کے ماربل کے بنے پکے فرشوں پہ بندھی بھینس بھی نظر آرہی تھی۔ اس نے انصر کی توجہ دلائی۔

”بھئی دیہاتی لوگ ہیں، گھروں میں جانور باندھنے کی عادی ہیں۔ تم پر کوئی لازم تو نہیں کہ تم بھی اپنے گھر کے صحن میں بکریاں یا مرغیاں پالو۔ ادھر ادھر مست دیکھو اور اپنا گھر اپنی مرضی سے سجاؤ۔“

کرائے کے لحاظ سے ان کا گھر واقعی بڑا کشادہ تھا مگر وہی بھدے رنگ، نقش و نگار، مکان کی پیشانی پہ ماشاء اللہ، حق باہو وغیرہ خوش خط لکھے تھے۔ چھت پہ نگے سفید لوہے کے جھنگے پہ رنگ برنگ عجیب ڈیزائن کے پھول تے بنے تھے۔ دروازوں کے رنگ سبزی ماربل نیلے تھے دیواروں پہ گلابی قلعی تھی حتیٰ کہ فرش کا چپس بھی نیلے، گلابی اور نیلے رنگوں میں تھا۔ کچن اگرچہ کافی بڑا تھا مگر پرانے فیشن کا۔ زمین پہ بیٹھ کے پکانے کا سہم تھا۔ اسے کھڑے ہوئے کو کنگ کرنے کی عادت تھی اور یہاں چولہا اونچا رکھنے کا کوئی انتظام ہی نہیں تھا اس نے ایک پرانی میز رکھوائی اور اس پہ چولہا نصب کر لیا۔ غسل خانہ رہائشی کمروں سے باہر صحن میں تھا۔ کڑکٹی سردیوں میں جب چھوٹے بچے کے ساتھ راتوں کو انھ کے باہر جانا پڑتا تو مالک مکان سے کہہ کے بڑے والے بیڈ روم کے ایک کونے میں دیواریں کھڑکی کر کے مختصر سا بیچ لٹا کھٹ بٹا لیا۔ وہ

ہوم اکناٹس کی اسٹوڈنٹ تھی۔ کتراسے گروٹیا میکنگ کے فنون میں ماہر۔ جینز میں اپنے ہاتھ سے کئی آرائشی نمونے نکال کے سجائے۔ بچے سنوار کے قابل دید بنایا۔ پھر بھی اس کا دل نہ لگا یہاں۔ بندیں تو گجرات میں بھی کئی کئی مینوں آئیں یہاں آکر تو وہ دونوں بالکل کٹ کے رہ گئے۔ داروں سے عید بقر عید پہ وہ لاہور چلے جاتے ہمارے کی دو بہنوں کے علاوہ شستہ کا پورا میکہ بھی آباد فیصل آباد میں انصر کی چھوٹی بہنیں رہتی تھیں وہاں مل آتے مگر ان میں سے کوئی کبھی بھی یہاں نہ آیا۔ لاہور میں وہ فارغ ہوئی سارا دن اپنے گھر میں سنبھالتیں پھر بھی دن ایسے گزر جاتا یہاں مکمل داری اور چھوٹے بچوں کے ساتھ کے باوجود ان کا حال گھر کی صفائی کرتی، باہر کے فرش دھو، یہ کمروں کا پھیلاوا سیمپٹی، ڈسٹنگ کرتی، مشین لگا کر تور جو کپڑے پھیلا بھی دیتی، خشک کپڑے استری بھی کرتی، کھانا پکاتی تو وہ بہت تیز دھودیتی۔ اس بڑا ہوا تو اس کے اسکول جانے کا وقت ہوا اس کے ساتھ ہی انعم بھی اسکول جانے کے لاہور گئی تو اس نے دل کڑا کر کے انصر کو انہیں گجرات اسکول میں داخل کرانے کی اجازت دے دی وہی انصر کے دوستوں کے بچے بھی پڑھتے تھے اور اس داروں پہلے سے ہی ادھر کا گھر شستہ کامل نہیں مانتا تھا۔ چھوٹے بچوں کو اتنی دور کے اسکول بھیجنا کون چاہے گا۔ ساڑھے چھ بجے گھر سے نکلتے اور تین بجے واپس مگر اس کے سوا چارہ بھی تو نہیں تھا اس علاقے کی کوئی اسکول ایسا نہ تھا کہ وہاں بچوں کو داخل کرالیا

جیسے تمہے کر کے چار ساڑھے چار سال کراؤ ہی تھے کہ انصر کے ٹرانسفر آرڈر آگئے۔ اس نے بروموشن کر کے اسے لاہور بھیجا جا رہا تھا۔ وہ مکمل ”عمی“ بچے بھی چمکنے لگے یہ جان کر کہ نانا اور چچا گھر جانے کے لیے اب انہیں عید اور گرمیوں

الٹ کا انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔

انصر نے شغفنگ کے لیے ایک ہفتے کی چھٹیاں مترانوالی میں چونکہ سرکاری کوارٹر اور فلیٹ میں تھے اس لیے اس نے وہاں رہائشی مکان کرائے پہ مل کیا تھا اور اسے محکمے کی جانب سے تنخواہ میں لایا لاؤنس دیا جاتا تھا، لیکن لاہور میں راوی روڈ پہ پاکستان سے کچھ ہی فاصلے پہ یہ پل کے ساتھ بنی فلیٹ میں فرسٹ فلور پہ ایک فلیٹ اسے لاث ہوا شستہ نے دیکھا تو حیران رہ گئی۔

یہ فلیٹ اتنے بڑے گریڈ کے اعلا فلیٹ ملا ہے تو پچھلے ملازمین کے کوارٹرز کا کیا

دروازہ کھلتے ہی برآمدہ غبار بھری تھی جس کی بیرونی قسمت جالی کی دیوار تھی، جس سے تازہ ہوا باہر آتی۔ بمشکل اندر آتی تھی، اور دوسری جانب دو دروازے تھے ایک دروازہ ڈرائنگ ڈائننگ میں کھلتا تھا اور دوسرا کچن میں۔ ملاؤں میں سے بیڈ روم، کچن اور ڈرائنگ روم کے دروازے کھلتے تھے۔

ایک جانب دیوار گیر ہال داری بھی نصب تھی۔ میز نما صحن اتنا مختصر تھا کہ وہاں بمشکل کپڑے دھونے اور سکھانے کا ہی کام ہو سکتا تھا، بچوں کے کھیلنے کے لیے جگہ بالکل مناسب نہیں تھی۔ فلیٹ اندر سے تو پھر بھی بہتر حالت میں تھا۔ مگر باہر کی حالت ابتر تھی اور یہاں ہاٹ روم تو بہت ہی خراب حالت میں تھا۔ ہاٹ کے پلستر اکھڑے ہوئے دروازوں کے ٹوٹ کے لٹکے ہوئے، کچن کی دیواروں پہ چمکنالی گچ میں کے دھبے، دوسرے کمروں کی دیواروں پہ گچوں کی لکیریں، گچوں کے جا بجا نشانات۔ اس کی گچوں میں اپنے پچھلے گھر کا نقشہ پھرنے لگا جس میں اسے کوئی خوبی یا کشش نظر نہیں آتی تھی۔ وہ کم از کم ان تو اتر سے بچتے مکروہ آوازوں والے گھر میں سے تو محفوظ ہی تھے۔ شہر کے داخلی

دروازے پہ ہونے کی وجہ سے یہ علاقہ ہر وقت ہی ٹریفک کی بد نظمی کا شکار رہتا تھا۔ بسیں، ویکٹیں، فلائنگ کوچز، ٹرک غرض ہر قبیل کی ہر چیز یا آواز بلند اپنا احساس دلاتے ہوئے اس بلڈنگ کے آگے دھواں چھوڑتے گزرتی تھی۔ پچھلے مکان کی تمام خوبیاں ایک ایک کر کے اس پہ آجا کر ہونے لگیں۔

گیت سے داخل ہوتے ہی بڑا سا پختہ صحن، دونوں جانب چوڑی کیاریاں پھولوں سے لدی ہوئیں، ایک جانب درخت کے سائے میں اونچا کھڑا اور اس میں لگا پینڈ پمپ جس سے سخت گرمیوں میں بھی ٹھنڈا پانی آتا رہتا۔ دو سیڑھیاں اونچا برآمدہ جس پہ لگی چھتیں روکتی اور دھوپ کو بہ وقت ضرورت اندر داخل ہونے سے بچاتیں اور ستونوں سے لپٹی بلیس تازگی پیدا کرتیں۔ برآمدہ کافی کھلا سا تھا۔ سردیوں میں تو خوب ہی کام آتا۔ دھوپ سیدھی اندر اترتی اور دوپہر ڈھلے تک رہتی۔ بچے زیادہ تر یہیں کھیلتے اور پڑھتے۔ اندر داری بھی جس کے دو جانب کمروں کے دروازے تھے، کچن، اسٹور، ڈرائنگ ڈائننگ، دو بڑے بیڈ روم۔

وہ تب تو چپ رہ گئی۔ ای کی طرف آکر کہے بغیر نہ رہ سکی۔

”انصر! کیا ہم اس سرکاری فلیٹ کے بجائے کہیں اور نہیں رہ سکتے۔“

”کیوں؟ پسند نہیں آیا؟“

”اتنا چھوٹا سا۔“ وہ دبے دبے لہجے میں بولی۔ ”ماشاء اللہ سے تین بچے ہیں۔ اس فلیٹ میں تو ایک ہی بیڈ روم ہے اس میں بھی سب نہیں سو سکتے اور لاؤنج اس طرح کا ہے کہ اس میں کوئی بیڈ لگ ہی نہیں سکتا، ڈرائنگ ڈائننگ بھی چھوٹا ہے اور بچوں کے کھیلنے کے لیے ذرا بھی کوئی جگہ نہیں۔ کچن دیکھا آپ نے؟“

”ہاں دیکھا ہے۔ ویسا ہی ہے جیسا تم چاہتی تھیں۔ اس گھر کا بغیر شہافت اور بغیر کاؤنٹر کا کچن نہیں پسند نہیں تھا اس کچن میں تو امریکن اسٹائل کے کینبٹ

ہیں ماربل کے کاؤنٹر ہیں۔“

”مگر کھڑے ہونے کی جگہ بھی مشکل سے بن پاتی ہے۔ فریج بھی شاید ہی رکھا جاسکے اور کینٹ اس کی لکڑی تو دیکھ کھائی لگ رہی تھی۔“

”اب جو بھی ہے گزارا کرو۔ گجرات والا گھر بننے کے لیے لگا ہوا ہے۔ ہمنوں کو ان کے حصے دے کے جو رقم ملے گی اس سے درمیانے درجے کے علاقے میں کوئی پلاٹ تو خریدا جاسکے گا اگر کچھ اور سال سمجھ داری سے گزارا کر لو گی تو ہم انشاء اللہ اپنا گھر بنانے کے لائق ہو جائیں گے۔ اس نے سمجھانے کی کوشش کی تو امی نے آنکھ کے اشارے سے انصر کو مطمئن رہنے کا کہا۔

”جاو بیٹا! تم نہاد ہو کر کچھ دیر آرام کر لو اپنے ابو کے کمرے میں، خیر سے کھانا لگے گا تو میں بلواؤں گی۔“ اس کے جانے کے بعد شستہ کی جانب متوجہ ہوئیں۔ ”کیسی نامناسب باتیں کر رہی ہو تم؟ وہ مرد ہو کے اپنا گھر بنانے کی فکر میں لگا ہے اور تم عورت ہو مگر ذرا احساس نہیں، ارے لگی، کراپوں اور بلوں کے چکر میں پھنس گئیں تو کبھی اپنا گھر نہ بنا سکو گی۔ کچھ سال اسی فلیٹ میں ”اوکھے سوکھے“ گزار لو۔ اسی بچت میں مکان کی تعمیر شروع کر دینا آہستہ آہستہ خیر سے اب انصر کی تنخواہ بھی تو بڑھی ہے ناں۔“ انہوں نے اپنے پسندیدہ فقرے ”خیر سے“ کی تکرار کے ساتھ بات مکمل کی تو وہ سر ہلا کے ہوئی۔

”جی امی جی! اسی لیے تو میں سوچ رہی ہوں کہ کرائے پہ نسبتاً کوئی اچھا مکان لے لیا جائے کسی اچھے علاقے میں۔ وہاں تو ٹریفک کا شور اور آلودگی اس قدر ہے۔ میرے بچے کھلی جگہ یہ رہنے کے عادی ہو گئے ہیں، اس فلیٹ میں تو ٹھیلنے کے لیے دفن کا صحن

بھی نہیں۔ کمرہ بھی کوئی فالتو نہیں کہ بچوں کے لیے الگ سے سیٹ کر دوں جبکہ وہاں کھلی چھت، بڑا سا صحن۔۔۔۔۔“

”اچھا یہ بتاؤ مٹر انوال میں تم کرایہ کتنا دیتے

تھے؟“ امی بات کاٹ کر بولیں۔

”پہلے بارہ سو، پچھلے سال پندرہ کر دیا تھا۔“

”اور تنخواہ میں کتنا اضافہ ہوا ہے خیر سے؟“

”تین ہزار مگر آپ کیوں پوچھ رہی ہیں؟“ وہ ح

سے بولی۔

”ناکہ ذرا تمہاری خوش گمانیوں کا بخار کم کر۔۔۔“

لی لی چھ سال سے لاہور سے باہر ہو، تم کیا جانو یہاں

زندگی کی محنتی ہو گئی ہے۔ پندرہ سو چھوڑو، تم اگر

ساری زائد تنخواہ یعنی پورے تین ہزار بھی کرائے میں

دینا چاہو تو اس فلیٹ جیسا مکان بھی مشکل سے ہی مل

پائے گا۔“

”کیا کہہ رہی ہیں آپ؟“ اسے یقین نہ آیا۔

”پچھلے بار پچیسویں میں جب تم آئی تھیں تو میں

تمہیں غمت کے گھر لے کر گئی تھی یاد ہے نا؟“ انہوں

نے اس کی چچا زاد بہن کا خوالہ دیا۔ ”کرشن مگر میں

والے پورشن میں رہتی ہے۔ تم نے دیکھے تو ہوں

اس کے دونوں کمرے بچے کھڑکیوں کے ڈھکے ڈھال

تھے، مجھے بچے فدائی بالوں پر بھی بیٹھنا پڑا۔

کے صحن میں کھتی ہے۔ بے چارے بچے کھانے لگیں

ساتھ ہی مالک مکان شکایت بھیج دیتے ہیں کہ شور

آ رہا ہے پورے چار ہزار کرایہ دیتی ہے وہ ان ”وکھ

کا۔“

”کیا واقعی؟“ اس کی نگاہوں میں غمت کا کمرہ

نگیا۔

”ابھی تو اور سنو، تمہیں تو پتا ہے کہ خیر سے

بھائی کا ناصر بیوی بچے سمیت جرمنی سیٹل

ہے۔“ اب انہوں نے ابو کے ایک دوست کا ذکر

”مسو ریاض بھائی نے گھر کا ایک پورشن کرائے

دیا ہے پورے آٹھ ہزار میں۔“

”آٹھ ہزار؟ اتنا کرایہ بھی ہوتا ہے؟“

”ارے یہ تو کچھ بھی نہیں۔ گلبرگ، ماڈل ٹاؤن

ڈیفنس میں تو پچاس پچاس ہزار کے کرائے

کو ٹھیاں ملتی ہیں، فلیٹوں تک کے کرائے ہیں

اور ہیں میں نے تو صرف تمہیں متوسط علاقوں

کے ریت بتائے تھے۔ اب تم خود سوچو، کرائے کا مکان

یہاں کی عقلندی ہے، یہی تو سرکاری ملازمت کی

مرتبہ ہے، اگر تنخواہ کم ملتی ہے تو دیگر مراعات تو ملتی

ہے۔ کرایہ نہیں، بجلی، جتنی مرضی استعمال کرو، پانی

اس کی بھی فکر نہیں، مالک مکان کی چیخ چیخ نہیں۔

یہ اور کیا چاہیے۔“

”اب ایسا بھی تمہیں کہ تمام سرکاری افسران محکمے

کے الاٹ کردہ رہائشی جگہوں پہ ہی رہتے ہوں، آخر

اس بھائی جان بھی تو ہیں شادمان میں کمرشل ایریا

میں کتنی ہے ان کی۔ جس لحاظ سے آپ نے کرائے

دے ہیں ان کی کو بھی بچی پندرہ ہزار سے کم کرائے پہ

ہو کی اور وہ انصر کے کزن رجب بھائی جان، وہ بھی اسی

کے میں ہیں، انصر سے کم گریڈ ہے ان کا اور گجرات میں

کھانا اور اچھا ذاتی مکان ہے۔ یہ سب کیسے انور

ہیں پھر؟“

”ابو! اتنا سمجھا، تمہیں، مگر بات ٹیٹھی ہی نہیں

ملتی۔“ امی نے کہیں۔ ”اب امی کی امی نہیں

بجھ نہ پاؤ کہ سرکاری کاموں کی تیرک کی طرح

والی تنخواہوں کے باوجود یہ لوگ جائیدادیں کیسے

کامی کر لیتے ہیں، حرام کی کمائی سے نری حرام کی۔

اب خدا کا واسطہ ہے، کبھی بن کے بہت پوچھنے بیٹھ

کہ حرام کی کمائی کیسی ہوتی ہے۔“ امی سچ سچ تپ گئی

اور اسے یہ یاد رکھنے کی ضرورت تو تھی نہیں کہ

حرام کی کمائی کیا ہوتی ہے۔ ابو سے ساری عمر ہی حرام

کمانے والوں کے لیے الغنیش اور گالیاں سنی تھیں۔

وہ کاروباری آدمی تھے، دیانت دار اور کھرے۔ سب

ان سے کوسوں دور رہ کے اپنا بزنس کیا تھا۔ ان کے

بزنس شروع کرنے والے ”جدید کاروباری

مذہب“ کو نت نئے نام دے کر جائز قرار دیتے

کہاں کے کہاں پہنچ گئے تھے مگر وہ اپنی اسی

تجربہ زندگی سے خوش تھے اور اس کا سرا اپنی

ایمانداری کے بعد امی کی صبر و شکر والی عادت کے سر

باندھتے تھے۔

اس نے ابو کی بات نہایت دھیان سے سن کر ذہن

میں نبھانے کیسے بٹھالی، امی کی باتوں سے اس کی

آنکھیں کھل گئیں، وہ لرز اٹھی۔

”امی ٹھیک کہتی ہیں۔ کچھ عرصہ ایسے ہی رہی۔

زندگی ہبیلی پہ چھپے نقش تو نہیں جو انسان جیسے لے کر

پیدا ہوا سدا ویسے ہی رہیں گے۔ یہ اتار چڑھاؤ تو آتے

ہی رہتے ہیں۔ مجھے ثابت قدمی سے اپنے شوہر کا ساتھ

دینا ہے، نا کہ ان کے اگلے کردار پہ کوئی دھتکہ نہ لگے۔“

اس نے تہیہ کیا اور خوش دلی سے شغفنگ میں جت

گئی۔

مگر وہ نہیں جانتی تھی کہ آج کے زمانے میں ایمان

کے رستے یہ ثابت قدمی سے ڈٹے رہنا صرف مرد کے

لیے ہی مشکل نہیں بلکہ عورتوں کے لیے بھی کتنا

دشوار ہے اس کا اندازہ اسے کچھ ہی دنوں میں ہو گیا

تھا۔ امی نے تو صرف کرائے کے مکانوں کی بابت اسے

آگاہ کیا تھا، دیگر اخراجات کا ذکر کرنا وہ بھول گئیں۔ وہ ہر

چیز کی قیمت کا مقابلہ اس چھوٹے سے قصبے کی قیمتوں

سے کرتی تو ہکا بکا رہ جاتی۔ پورے مٹر انوال میں مرغی کی

کوئی باقاعدہ دکان نہ تھی، ہاں دیسی مرغی اور انڈے مل

جاتے تھے دراصل دیہاتی علاقوں میں اب بھی مرغی

صرف مہمان نوازی کے لیے مخصوص ہے۔ انصر

گجرات کے نزدیک اپنے دوست کے پولٹری فارم سے

مہینے بھر کے لیے اکٹھا مرغی کا گوشت خاصی رعایتی

قیمت پہ لے آتا تھا۔ گوشت کے لیے بھی دو یا تین

دکانیں تھیں جہاں اسی ”نوے روپے کلو تک گوشت

اچھا مل جاتا تھا۔ مگر یہاں تو مرغی گاہی ریت نوے

روپے کلو تک پہنچا ہوا تھا اور بکرے کے سوا سو روپے

بچے چند گنی، چنی سبزیاں ہی کھانا پسند کرتے تھے، ”آلو، مٹر“

گا جو وغیرہ گوشت بھی خاص رغبت سے نہیں کھاتے

تھے ہاں کباب یا کوٹے بنے ہوتے تو کھا لیتے البتہ والیس

وغیرہ دونوں چھوٹے بچے شوق سے کھاتے تھے خود وہ

سبزیاں پسند کرتی تھی مگر انصر کو وال اور سبزی بنا گوشت کے تو ہضم ہی نہ ہوتی تھی۔ وال چاول بنے، آلو انڈے یا کسی اور سبزی کی بھیجا تو وہ برے برے منہ بناتا رہتا۔ اسے اٹھ کر کباب تلنے پڑتے یا آملٹ بنانا پڑتا۔ انڈے بھی تو رلتے پھرتے تھے گھر میں۔ رجو کے گھر جگہ کم تھی، اس نے شستہ کی اجازت سے اپنی کئی مرغیاں اس کے صحن کے ساتھ والی ڈیوڑھی نما گلی میں رکھ چھوڑی تھیں۔ روز کئی ایسی انڈے وہ اس کے منع کرنے کے باوجود بچوں کے لیے وہاں چھوڑ آتی اور یہاں کبوتر کے سائز کے انڈے بھی تیس سے پینتیس روپے درجن تک ملتے۔ دودھ بھی وہ اٹھارہ روپے لیٹر والا لیتی جس پہ جھلی سی ملائی آتی۔ گوالے سے شکایت کی تو جھٹ بولا۔

”باچی آپ بیس روپے والا لکوائیں۔“

گویا یہاں دودھ بھی قیمت کے لحاظ سے اچھا ملتا ہے۔ وہ کڑھ کے رہ گئی۔ بارہ روپے کلو میں وہ اتنا عمدہ دودھ لیتی تھی جن پر روز سالا بھر کے ملائی کا لہو تھا۔ بچے اکثر ناشتے میں ٹوس ملائی کے ساتھ ہی کھاتے۔ اکثر آس پڑوس سے بھی تحفتاً دودھ آجاتا۔ سبزیاں بھی اکثر پڑوسی بھجھتے رہتے تھے، کوئی بیٹنگن لا رہا ہے، کوئی ٹوکری بھر کے ٹماٹر، کسی نے تازہ بھنڈی توڑ کے بھج دی۔ خود اس نے بھی ایک طرف دھنیا اور پودینہ اگا رکھا تھا۔ اب لاہور میں وہ سبزی کے ساتھ پانچ روپے کے چند پتے دھنپے کے خریدتی تو یاد آتا کہ دھنیا وہ دن میں تین بار اپنی کیاری سے توڑتی۔ یہاں ہر سبزی تقریباً ”دگنی قیمت کی تھی۔ بچوں کو اسکول داخل کرانے کا مرحلہ آیا تو نیا مسئلہ پیدا ہوا۔ عام سے درمیانے درجے کے اسکولوں میں بھی فیس تین سو روپے سے کم نہ تھی۔ اچھے معیار کے انگلش میڈیم اسکولز میں چھ سو سے لے کر دو اڑھائی ہزار تک تھی۔ وہ تعلیم کے معاملے میں کمپروماز کرنا نہیں چاہتی تھی چنانچہ علاقے کے ایک اچھے اور بڑے اسکول میں تینوں بچوں کو ہی داخل کرا دیا جہاں یوں تو فیس آٹھ سو

روپیہ تھی مگر تینوں کو اکٹھے داخل کرانے سے چھ سو دونوں کی بالترتیب ایک سو اور دو سو کم کر دی گئی۔ پہلے مہینے بھر کا بچن جتنے بجٹ میں چلاتی تھی، وہ دن بھر بڑھ کر دگنا ہونے کے قریب تھا۔ وہ بساط بھر کر لے کر لئی۔ بازار جانا اور پھر ایک ایک چیز ناپ تول کر حساب سے خریدنا، نری درد سہی تھی ہاں البتہ اندر مطمئن تھا اور اسے غیر مطمئن کرنے کے خیال سے اس قدر سہمی ہوئی تھی کہ اپنی پریشانی کو خود بھی جیسے کی کوشش کرتی تھی مبادا اخراجات اور تنخواہ کا یہ متوازن ہونا اسے ڈر گناہ دے، پھر بھی نجانے کیسے وہ باتوں باتوں میں منگائی کاروبار روٹی تھی تو انصر نے اسے طعنہ دے دیا کہ لاہور آنا اسی کی خواہش تھی۔ وہی گاؤں کی سادہ زندگی سے ناخوش تھی اب مجھے وہ حسب عادت صرف سوچ کے ہی رہ گئی کہ محض میری خواہش کے نتیجے میں تو یہ سرفرازیوں میں سے لایا گیا اور اس سفر سے قبل تو بھی آپ کو یہ خوشی کا خیال نہ آیا اس کی خاموشی کا شرمندگی جائے۔

”اور پھر کوئی سونے کے بھاؤ تو نہیں ملتی ہوں سبزی۔ معمولی سا فرق ہی ہو گا نا، تنخواہ میں بھی دس ہزار کا اضافہ ہوا ہے۔“

”تو تین ہزار تو آپ اپنے پاس ہی رکھتے ہیں۔ چپ نہ رہ سکی۔“

”اپنے پاس نہیں رکھتا، کمیٹی ڈالی ہوئی ہے تین کی۔ جیسے ہی نکلے گی پلاٹ پہ مکان کا ڈھانچہ ہی لگوں گا۔ اگلی کمیٹی میں کچھ اور کام ہو جائے گا۔ آہستہ ہی گھر بنے گا۔ باقی کی تنخواہ تو پوری تمہیں ہوں جس میں سے تمہیں صرف اور صرف بچوں کے لیے یا اپنا اور بچوں کا خرچ نکالنا ہے۔ کوئی کرایہ بل کی درد سہی نہیں۔ یہ سہولت کسی کھاتے ہی نہیں آتی۔“ اس نے کئی بار کی کسی بات دہرائی اکتا گئی۔

”ٹھیک ہے،“ مانتی ہوں مگر یہ بھی تو دیکھو۔ اخراجات بھی اسی حساب سے بڑھے ہیں۔“

”کیسے اخراجات؟ بلکہ صاف صاف کہوں تو میں نے نوٹ کیا ہے تم یہاں آ کر کچھ زیادہ ہی کٹوتیاں کرنے لگی ہو ہر بات میں۔ بچوں کا اور میرا لچ باکس اتنا بے دلی سے بناتی ہو پہلے تو سینڈ وچز، سلاڈ اور کوئی نہ کوئی میٹھی چیز ضرور ہوتی تھی۔ کئی کئی دن ہو جاتے ہیں شام کو خالی چائے ہی پینے کو ملتی ہے۔ ہاں کبھی کبھار چار پکوڑے بن جاتے ہیں۔ دیکھ رہا ہوں کہ بچوں کو کبھی ان کی پسند کا ناشتہ نہیں ملتا۔ انعم کو بوائے اسل انڈہ چاہیے تو تم اسے سب کے لیے بنا آلیٹ کھانے پر مجبور کرتی ہو، انس کو دودھ میں ولیہ کھانے کا جی چاہے تو تم ڈائٹ ڈیٹ کے بن چائے میں ڈبو کے کھلا دیتی ہو اور احد ملائی مانگتا ہے تو جیم لگا دیتی ہو سلاکس پہ کیا میری حق حلال کی کمائی اتنی بے برکت ہو گئی ہے جو بچوں کو ان کی پسند کا کھانا بھی نہیں مل پاتا۔“

پالنے میں۔ یہ آج کل کی مائیں صرف اپنی
وجہ سے بچوں پر عجیب و غریب فلسفے سمیٹتی
ہیں۔“

اب کے شہزادوں اور شہزادی کی فرمائشوں سے کوئی بھی نہیں برقی جائے گی۔“

اس نے سچ سے بات بناتے ہوئے ہلکے بھلکے میں مسئلہ ختم کر دیا اور اپنے لیے نئے مسئلے بن کر لیے۔ یہ تو اس پر کھل ہی گیا تھا کہ انصر پہلے سلطانہ ٹھنڈے مزاج کا لگا تھا، اتنا تھا نہیں۔ اس میں لگال اس کا اپنا تھا۔ جو چھوٹی چھوٹی باتوں کو خاطر لاتے ہوئے دل میں بھول جایا کرتی تھی۔ اس سے علاوے میں گزارے گئے محدود طرز زندگی پر کچھ بیزار تھی بھی تو خوش دلی سے گزارا کرتی تھی۔ اس کے دل میں پیدا ہونے والے چھوٹے مسائل کا ذکر یہ سوچ کر نہیں کرتی تھی کہ اس کے اختیار میں تو ہے، نہیں خواہ مخواہ ذکر سے فائدہ۔ گزر ہی جائیں گے یہ دن اور راتیں۔ وہ اس سادہ ماحول میں رچ بس گئی تھی۔

کے کام بھی کر دیتا، ڈسٹنٹک اسٹری وغیرہ کے کام بھی کر لیتا۔ شہتہ نے لڑکے کو آہستہ آہستہ گھر کے دوسرے کاموں میں شریک کرتے ہوئے ماسی کو ہٹا دیا۔ یوں اپنے طور پر وہ بات سنبھال چکی تھی لیکن ایک بار توجہ دلا دینے پر پچھتا رہی تھی کہ اب وہ گاہے بہ گاہے اس سے خرچے کی بابت استفسار کرتا رہتا جبکہ اس سے قبل اس نے بھی ان معاملات میں دخل نہ دیا تھا۔ قدرتی طور پر گھر میں مہمان داری بھی بڑھ گئی تھی۔ شہتہ کا میکہ تو یہاں تھا ہی، انصر کی دونوں بہنیں بھی مہینے میں ایک دو چکر لگا لیتیں اس طرح ہر ہفتے ایک نہ ایک دن تو ضرور مہمان داری میں گزرتا خصوصاً جب اس کی نندیں آتیں تو انصر ضرور یہ چیک کیا کرتا کہ اس نے ان کی مہمان نوازی میں کوئی کسر تو نہیں چھوڑی، اس لیے وہ خاصا اہتمام کر رکھتی بعد میں چاہے کتنے ہی دن اسے جھٹ بیلنس کرنے میں لگ جاتے۔

”ششہ! اس نومبر میں ہماری شادی کو کتنے سال ہو جائیں گے؟“

اپنا حشر کیا کر لیا ہے۔ اچھا یہ تو بتاؤ تمہاری عمر کیا ہوگی اس وقت؟“

”اٹھائیس سال۔“ اس نے بغیر ڈنڈی مارے شرمندہ سے کہنے میں کہا۔

”تم سے چار سال بڑا ہوں میں اور صائمہ آپا مجھ سے دو سال بڑی۔ ان کا بڑا بیٹا کلچر پہنچ چکا ہے۔ بیٹیاں قدر برابر آگئی ہیں لیکن دیکھا ہے تم نے اب بھی کتنی فریش اور رنگ نظر آتی ہیں تمہارے تین بچے ہیں تو ان کے پانچ بھرے سسرال میں رہتی آتی ہیں اس لیے تم یہ بھی نہیں کہہ سکتیں کہ تمہیں کام کی زیادتی کے باعث وقت نہیں ملتا خود یہ توجہ دینے کا شادی کو چند سال گزرنے اور بچے بڑے ہو جانے کا مطلب یہ تو نہیں کہ عورتیں اپنا دھیان رکھنا چھوڑ دیں۔ میرے دوستوں کی بیویوں میں سے کئی کو تم جانتی ہو وہ محمود کی بیوی اور وہ تنویر کی اور کچھ نہیں تو آئے دن بالوں کے اسٹائل ہی بدلوانی رہتی ہیں۔ تم سے تو اتنا نہیں ہوتا کہ کٹنگ کروا کے بال ہی کسی ڈھب کے کروا لو کتنی سال سے گر رہے ہیں اب تو چوٹی بھی برائے نام ہی رہ گئی ہے۔“

وہ کھیانی سی اپنی چوبیا سی چٹیا سہلا کے رہ گئی۔ واقعی بال تو رہے نہیں اب چٹیا کا تکلف کرنے کی کیا ضرورت ہے جو گدی سے سکر تے سکر تے شانوں تک آتے بالکل ہی معدوم ہو جاتی تھی۔ شروع میں اس نے گرتے بالوں کو روکنے کی بڑی کوشش کی۔ کئی تیل لگائے، آزمودہ ٹونکے لڑائی کے، اشتہار دیکھ کے شیمپو منگائے، آٹے ریتھ سے بھنی سردھو یا مگر بے سود اور اب کتنے عرصے سے وہ ان بدستور گرتے بالوں سے یکسر بے نیاز ہو چکی تھی اور نت نئے شیمپو بدلنے سے اس کے بال بھی کہیں کہیں سے سفید ہونے لگے تھے۔

”کپڑے تو خیر تم ہفتے میں دو ہی بار بدلتی ہو، منہ بھی لگتا ہے کئی کئی دن ہمیں دھوئیں۔“

”خیر اب ایسا بھی نہیں۔“ اب کے وہ برامان کے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”پانچ وقت کی نماز پڑھتی ہوں۔ اتنی

گندی کیسے رہ سکتی ہوں۔ کپڑے بھی روز بدلتی ہوں اور وضو بھی پانچ وقت کرتی ہوں۔ خود ہی سوچ لیں کتنی دفعہ دھلتا ہو گا۔ ہاں اب یہ جھانپاں دوپٹے رہی ہیں ان کا کیا کروں۔“

”کپڑے بھی تو تمہارے ایک جیسے رنگوں کے بدلوانے بدلو، ایک برابر۔“ وہ گود میں رکھنا کئی طرف سے گراہا ہر نکل گیا۔

شستہ گھرے دکھ کے احساس تلے اسے دیکھ گئی۔ ایسا نہیں تھا کہ انصر کی کہی گئی تمام باتیں تھیں وہ مانتی تھی کہ بے حد مصروفیت اور بڑے کام کے باعث اس کی حالت کچھ کی کچھ ہو چکی ہے اسے گھر اور بچوں کے ساتھ ساتھ خود یہ بھی تو چاہیے یہ اس کی کوٹاہی تھی اور انصر کی شکایت اور شوہر نے اس کے لیے سے شکایتی ہزاری اور اس کا دل چھید گیا۔

اس نے دراز کھنگالے، میک اپ کا سارا سامان بچوں کے بعد ڈریسنگ ٹیبل سے غائب ہو کر اس کے کپڑے خزانے میں چھپ چکا تھا۔ اس کی خیل پالش استعمال نہ ہونے کے باعث اس کی تھیں، کئی لپ اسٹیکس تقریباً ”نئی تھیں مگر پڑے ان میں بدبو آنے لگی تھی۔ اس نے وہ پرانی اشیاء پھینک دیں اور فہستہ ”نئی سنہال لے اور نئی میک اپ کٹ جو پچھلے سال ہی صائمہ کا گفٹ کی تھی، سیفٹ سے نکال کر ڈریسنگ ٹیبل دراز میں رکھ دی۔ اس کے بعد دوپٹے کی پانچ کے علاوہ کچھ نہ تھا۔

”صحیح ہی تو کہتے ہیں وہ شادی ہونے اور نہ ہو جانے کے بعد خود سے اس قدر لا روا ہو جاتا کہ عقل مند ہی ہے۔“ وہ کپڑے استری کرنے کا فی الحال ملتوی کرتے ہوئے نیم گرم پانی میں ہاتھ کے بیٹھ گئی۔

وہ ان لڑکیوں میں سے تھی جنہیں گھٹی میں گھول کے پلا دی جاتی تھی کہ ان کی ذات سے ان کا شوہر کو کوئی بھی شکایت پیدا نہیں ہونی چاہیے۔

انصر کے ماتھے پر بڑی ہلکی سی شکن بھی اسے بے اور مضطرب کر دیتی تھی اور یہاں تو اس نے کھلے میں اس سے گلہ کیا تھا سوا زالہ کرنا تو اس کا فرض تھا۔

بہر کا سودا خریدنے اور بچوں کی فیس دینے کے اس کے پاس کافی رقم موجود تھی لیکن ابھی مہینے خرچہ کرتی تھی روزمرہ کے خرچے کے علاوہ کسی بات کوئی اضافی ضرورت پڑ سکتی تھی اس لیے اس ان پیسوں کو چھپڑنے کی ہمت نہ کی۔ پچھلے دنوں کا پہلی بار اس کے گھر آئے تھے اور جاتے ہوئے ان کے ساتھ دیکھ کے ساتھ ساتھ اسے بھی ہزار ہما گئے تھے۔ اس سے وہی ہزار کانوٹ نکالا۔ اس کی احتیاط کے ساتھ برس کے اندر دھنی خانے میں لی کر سنہال لیا تھا کہ کچھ اور جمع شدہ پیسے اس میں وہ بچوں کی سرویوں کی یونیفارم بنوائے گی۔

اس کی تو خاصے دن میں سردیاں آنے میں، اللہ اور اس کے گھر۔ ”سوچ کر اس نے یہ ہزار خود یہ خرچ کرنا فیملی کر لیا اور اس سلسلے میں برابر کے فلیٹ میں سے مدد لینے کا سوچا کہ ایک تو پوری بلڈنگ اس سے ہی زیادہ دعا سلام تھی اور پھر وہ ان چیزوں کے بارے میں معلومات بھی خاصی رکھتی تھی، اس کی سی بیٹی آج کل ایک پارلر میں یونیفارم کا کورس لے رہی تھی۔

اس نے اگلے روز ہی جانے کا پروگرام بنالیا۔ واپسی کے مارکیٹ سے اپنے لیے ہینڈ ڈاکی اور انر اور لپ اسٹک کا ایک نیا شیڈ لیا۔ اسی دکان سے اس کی کٹنگ بھی کر دی اور ہینڈ ڈاکی کہیں نے اسے ایشن، ہلیج اور گھریلو ماسک بھی لکھ دیے۔

اس کے بعد اس نے میرون اور وائنٹ برنٹ کا ۱۸ جو اس نے کچھ ماہ قبل ہی سلوایا تھا جبکہ ایک سال تک نئے کپڑے گھر یہ روزمرہ کے میں نہیں لاتی تھی۔ کانوں میں سلور ٹکینے لگے، بال بالے پٹے، برگنڈی لپ اسٹک، مسکار اور

فیس پاؤڈر لگایا، پرفیوم اسپرے کر کے وہ تیار ہو گئی۔ ”یہ باہر کا روزانہ کیوں کھلا ہوا ہے، بچے کہاں سے آئے؟“ آفس سے آتے ہی انصر کو اسے دیکھ کر جھٹکا سا لگا۔ بچی سنواری مسکراتی شستہ اسے گزرے دنوں کی یاد دلانے لگی جب وہ اسے ہفتے بعد دیکھتا تو وہ یونہی پورے اہتمام سے اس کی منتظر ہوتی، وہ بے اختیار ہی آگے بڑھ کے اسے بازوؤں میں قید کر بیٹھا۔

”کیا کر رہے ہیں، بچے دیکھ لیں گے۔“

”سارا گھر خالی پڑا ہے، بچے کہیں باہر نکلے ہوئے ہیں۔“ وہ اس کے بازو سے ہٹ گئے ہوئے بالوں میں منہ چھپاتے ہوئے بولا۔

”ہیں، باہر نکلے ہوئے ہیں، اس وقت؟ دیکھو ذرا یہ حال ہے ان کا، ذرا توجہ لو، دھڑکھڑکھڑا کر، نظر بچا کے بھاگ جاتے ہیں۔“

وہ بچوں کو آوازیں دیتی اسے وہیں چھوڑ کر آگے بڑھ گئی وہ ٹھنڈی سانس بھر کے رہ گیا۔ آج اس نے کھانے پر بھی اہتمام کیا تھا۔ عموماً وہ رات کو ساڑھے سا کھانا ہی بناتی، ڈال، سبزی وغیرہ۔ ہاں البتہ صبح وہ ضرور اچھا کھانا بناتی کیونکہ انصر آفس میں بچ منگواتا تھا، اکثر دوپہر کا کھانا رات کے لیے بھی تھوڑا بہت بچ جاتا تاکہ اگر کسی کو ڈال چاول یا بھجیا یہ اعتراض ہو تو وہ یہ کھالے لیکن آج اس نے میکرونی اور ایل ڈال کے مایونیز کی سلاد بنائی تھی، قیمہ، بریانی، آلو کارائے اور بچوں کا فیورٹ چکن پکوڑا۔

”واہ جی واہ۔ آج تو بڑا دل کر لیا ہے، بیگم صاحبہ نے ورنہ تو چھٹی والے دن کے علاوہ شاید ہی کبھی ایک سے زیادہ ڈش بنی ہو۔“ انصر نے ٹیبل پر بیٹھتے ہی کہا۔

”اچھا ہے ناں، ہر روز پکوانوں کی بھرمار ہو تو جلد ہی دل بھر جاتا ہے۔ کبھی کبھی کی تبدیلی مزہ دیتی ہے۔“ اس کے جواب پر اس نے بھرپور نظروں سے اسے دیکھا۔

”ہاں واقعی، کبھی کبھی کی تبدیلی بڑا ہی مزہ دیتی ہے۔“ اس کی وارفتگی پر گھبرا کے شستہ نے بات ہی بدل ڈالی۔

”انس! یہ کیا صرف سلاو لو گے، چلو شاباش۔“
تھوڑی سی برائی بھی لو۔“

رات کو انصر کے اچھے موڈ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے بات چیت شروع کی۔ ”سینے پتہ ہے آج میں برابر والی یا سمین کے ساتھ مارکیٹ گئی تھی، بیوی پارلر کے لیے۔“

”وہ تو مجھے بتا چل گیا ہے میڈم۔ ظاہر ہے تم کوئی سٹڈیلا تو ہو نہیں کہ کوئی پری آئی اور اپنی جادوئی چھتری کے زور پر تمہارا حلیہ بدل کر چلی گئی۔۔۔ دیے پیچ رہی ہو۔“ وہ آج حقیقتاً ”چمک رہا تھا۔“

”لو ہو بات تو سن لیں، پارلر کی اونر یا سمین کی کزن ہے، اس نے پارلر کے ساتھ ایک ٹریننگ انسٹیٹیوٹ بھی حال ہی میں شروع کیا ہے۔ اس نے مجھے بھی آفر کی ہے۔“

”ٹریننگ لینے کی؟“

”نہیں، دینے کی۔“

”کک۔۔۔ کیا؟“ اس کے لبوں سے لگا چائے کا کپ چھلک گیا۔ ”تم تم ٹریننگ دو گی۔ ڈھنگ سے تیل تک تو لگا نہیں سکتیں میرے بالوں میں، سارا ماتھا اور گردن بھگو کر رکھ دیتی ہو، بال سوکھے کے سوکھے۔ میک اپ کی ٹریننگ کیا خاک دو گی۔“ وہ ہنستا چلا گیا۔

”آپ بھی میری بات دھیان سے نہیں سنتے۔“ وہ کچھ کچھ ناراض سی ہو گئی۔ ”وہ ہر طرح کا ٹریننگ انسٹیٹیوٹ ہے جہاں سلائی کڑھائی، انٹریئر ڈیکوریشن، پینٹنگ، کوئنگ، ہینڈی کرافٹس وغیرہ کے کورسز بھی ہوں گے۔ جب اسے پتا چلا کہ میں نے ہوم اکٹنا مکس کالج سے گریجویشن کیا ہے اور فلاور میکنگ، رگ میکنگ، مکرامہ، اسٹین گلاس ورک، فیووک پینٹنگ، پن ورک سب مجھے آتے ہیں تو اس نے بے حد زور دے کر مجھے آفر کی اپنے ہاں جاب کی۔ کیا خیال ہے آپ کا؟ کیا جواب دوں؟ ماحول ہے تو بہت اچھا وہاں کال صرف خواتین کا عملہ ہے۔ ویسے آپ خود بھی نسلی کر لیجئے گا۔“ اس نے ڈرتے ڈرتے اوھر دیکھا جہاں ایک دم ہی گنبد سنجیدگی چھا گئی تھی۔

”شستہ! کیا واقعی تمہیں جاب کی ضرورت ہے؟“

”نہیں۔۔۔ مجھے بھلا کیا ضرورت ہے؟“

میں کوئی جاب ڈھونڈنے لگی تھی، ہاں البتہ ضرورت ہے کسی ایسی خاتون کی جو بیک وقت ہنرمیں ماہر ہو میں نے بھی یہ سوچا کہ بچے اب ماہر ہوئے ہوں گے، اتنا کام نہیں ہوتا ان کا۔ پھر ناں بڑی اچھی ہے۔ صرف دس سے ساڑھے بارہ لاکھ کی بس دو کلاسز لینی ہوں گی مجھے اور ہفتے میں دو بجے بھی، لیسن کریں، گھر کا بالکل حرج نہیں ہو گا۔ پرامس اور پھر ہنر تو آزما تے رہنا چاہئیں ورنہ ہاتھ نہیں رہتے۔“

”چلو ٹھیک ہے کہ کے دیکھ لو، دل لگ گیا تو ہے ورنہ خواہ مخواہ خود پہ بوجھ لاوے کی ضرورت ہے جب تک سہولت سے کر سکو، کر لینا۔“ اس نے اجازت دی تو وہ دل ہی دل میں غور بلند کر کے اس سے پہلے بھی اس کے دل میں یہ خیال تھا کہ وہ بھی گھر کی گاڑی کھینچنے کے قابل ہو سکتی ہے۔

”آج ہی تو اسے یہ اعتماد ملا تھا کہ وہ بھی گھر کی پریشائیاں شیر کر سکتی ہے اپنے بچے کی۔“ ہزار آفر کیے تھے اسے مسز سلیمان نے، کیونکہ اس صورت میں انہیں تین ٹرینڈ پیپرزل دی تھیں۔

وہ اپنے چوڑے اسٹاف کے بکھیرے سے بچ کر ایک کو کنگ، بیکنگ کے لیے، ایک سلائی کے لیے اور ایک پینٹنگ کے لیے بھی بیوی کلاسز وہ خود لیتی تھیں اور بانی کے تمام شعبے اس بڑی سہولت سے شستہ کے سر ڈال دیے۔

سب ہی کام ایک دوسرے سے متعلق تھے۔ وقت میں وہ کسی کو پھول بنانے بھی سکھا دیتی اور مکر اسے کی ہنر سکھا دیتی۔ کسی کو آئل پینٹنگ، تیج ورک سے بیڈ شیٹیں اور کیشن کورز کو وہ بنانے کے گرتا رہی ہوتی۔ کام اس کی دلچسپی کے لیے وہ اس اضافی ذمہ داری سے گھبرائی نہیں بلکہ اعتماد بحال ہو گیا تھا۔ ہر مہینے ملنے والی ایک کاتصور ہی خوش آئند تھا جو گھر کے کتنے ہی کاموں

کے آسانیاں پیدا کر دے گا۔

♥ ♥ ♥ ♥

اب تاریخ سے اور ہفتے کا دن۔ کل ہی انصر نے اپنی تنخواہ پکڑائی تھی۔ اس بار کچھ شاپنگ کا بھی اس لیے یہ ویک اینڈ ای کی طرف گزارنے کا ارادہ کیا۔ انصر کو وہ صبح ہی آگاہ کر چکی تھی۔

وہ کے ہاتھ آفس میں بیچ باکس بھجوانے کے بعد باقی سائن فریج میں رکھا۔ رات کے لیے اس کی لبال کے رکھ دیے۔ نذیر کی روٹیاں، سائن ڈھک دیا۔ انصر کی استری شدہ شلوار قمیص بیڈ روم کے بعد اس نے بیڈ روم اور ڈرائنگ روم

کر دیا۔ انصر کے پاس تمام ڈبلی کیٹ چابیاں پہلے ہی در تھیں۔ نذیر واپسی پر اس کی ہدایت کے نظر نیکی لیتا آیا۔ وہ اسے ڈھیروں بدلیا کرتی تھی اس کو اسکول سے لے کر ای کے ہاں چلی آئی۔

اس نے لڑن معصومہ جو اس کی بہترین دوست بھی تھی، کو شہرہ بروگرام کے تحت وہاں موجود تھی۔

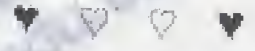
بیلیاں بچے نانی کے سپرد کر کے شاپنگ پہ چلی۔ وہی عرصے کے بعد شستہ کو کھلے ہاتھ سے ادا کرنے کا لطف ملا۔ چونکہ تقریباً ”تمام تنخواہ“

یہ کہ بعد انصر بری الذمہ ہو جاتا تھا اسی لیے وہ میان اور حساب کتاب سے ہر چیز خریدتی تھی۔ اس کے پاس مگر صرف انتہائی ضرورت کے سامان ہی ملتا تھا۔ کسی بھی ہنگامی صورت حال میں اس کے پاس مہینے کے آخر میں بھی رقم موجود ہو۔

نذیر، کبھی بچوں کی تفریح، کبھی کسی بیماری وغیرہ کے لیے خرچ ہو جاتے کبھی کبھی بچوں کے اسکول کی اضافی خرچہ نکل آتا، ”من فینو فنڈ“ چیریٹی فنڈ یا کسی کے نام سے، کبھی خاندان کی کسی تقریب میں خرچ ہوتا۔ لیکن آج وہ اس فکر سے آزاد تھی۔ تمام کے تمام پیسے خرچ کر لینے کے بعد بھی اس نے ڈھائی ہزار بچتے تھے جو اس کو آج کل میں ملنے لگے تھے اس لیے اس نے کئی ایسی چیزیں بھی

خریدیں جنہیں ضرورت ہونے اور بچوں کی خواہش کے باوجود بچھلے کئی مہینوں سے نظر انداز کر رہی تھی۔ ایئر فریشنر، شو پیپر کے دو ڈبے، مکچپ کی بڑی بوتل، اسٹریڈ کے دو فیلپورز، اسکواش اور شروت کی بوتلیں، نمکو اور بسکٹ کے پکٹ وغیرہ۔ تمام دالیں اور گرم مسالے بھی اس نے کوئی مقدار میں خریدے تاکہ زیادہ عرصے تک چل سکیں۔ اس فتح ڈیپارٹمنٹل اسٹور سے ان کا رخ اور نگار کیٹ کی طرف تھا جہاں سے اس نے میچنگ کی کچھ شلواریں لینا تھیں۔ اس کے جینز بری میں خاصی ساڑھیاں تھیں جو اب اس کے استعمال میں نہیں آتی تھیں۔ اپنے ہی انسٹیٹیوٹ میں سلائی کے شعبے میں لڑکیوں سے اس نے ان ساڑھیوں کے جدید فیشن کے قمیص دوپٹے بنوائے تھے۔ وہیں پر اس نے سیل سے تو لیے بیڈ شیٹس بھی لیں۔ اپنے لیے نازک سلور ڈورپوں والی سینڈل اور انصر کے لیے کاٹن کے دو ٹکے رنگ کے شلوار قمیض کا کپڑا خرید لیا۔ بچوں کے کپڑے اس نے یہ سوچ کر رکھے دیے کہ گرمیاں ختم ہو رہی تھیں اور سردیاں ابھی آئی نہیں تھیں اگلے ماہ انشاء اللہ بچوں کے گرم کپڑے ہی خرید لیے جائیں گے البتہ انس۔۔۔ کے لیے نیا اسکول بیگ، انعم کے لیے پنسل باکس اور احد کے لیے کلرنگ بکس لے لیے۔ نئے اسکول میں جانے کے بعد سے ہی انس کی فرمائش تھی کہ وہ ایسا ہی نئے فیشن کا بیگ لے گا جو اسکول کے دوسرے کئی بچے لے کر آتے ہیں، جن پر مشفقہ کمی ماؤس یا ٹیڈی بیر بنا ہو۔ اب کچھ دنوں سے انعم نے بھی ضد پکڑ لی تھی کہ وہ اپنی فرینڈ کے جیسا میوزیکل پیسنل باکس لے گی جس کو کھولنے سے خوب صورت دھنیں سنائی دیتی ہیں۔ شستہ نے وہی باکس اٹھایا مگر قیمت دیکھ کے رکھ دیا اور ایک نسبتاً کم قیمت مگر کیوٹ ساراؤنڈ ٹیمپ باکس لے لیا۔ ”انعم بیٹی ہے اور وہ بھی میری بہل جائے گی۔“ وہ سوچ کر مسکرائی۔ اگلے دن اتوار کو انصر بھی آ گیا۔ دوپہر کا کھانا کھا کے امی اور ابو کے اصرار کے باوجود وہ بس کچھ ہی دیر کے اور بچوں کو سند باؤ گھماتے

ہوئے گھر چلے آئے۔



”میلو جی ہاں میں انصر ملک ہی بول رہا ہوں۔“ انصر کے کسی جاننے والے کا فون آیا تو وہ ریسیور کاٹوں سے لگائے ٹیبل سے اٹھ کر صوفے تک چلا گیا۔

آج ان کی شادی کی آٹھویں سالگرہ تھی۔ ہمیشہ کی طرح اس نے گھر پر ہی انصر اور بچوں کی پسند کے کھانے پکائے۔ انصر واپسی پر کیک لیتا آیا اور آج تو شیشہ کو پہلی بے بھی ملی تھی سو اس کی مسرت دیدنی تھی۔ ابھی وہ کیک کٹ کے بیٹھی ہی تھی کہ فون آگیا۔ بچوں کو کیک اور سینڈویچ کھلاتے ہوئے بھی اس کا دھیان انصر کی طرف ہی رہا جو مسلسل فون پر کسی سے معذرت خواہانہ انداز میں وضاحتیں پیش کر رہا تھا۔

”جناب میں سمجھتا ہوں آپ کی بات۔ آپ کاروباری بندے ہیں۔ آپ کا تقاضا اور گلہ بالکل بجا ہے مگر یہ بھی تو دیکھیں میری جانب سے یہ تاخیر پہلی بار ہوئی ہے، کل یا پرسوں آپ تک رقم پہنچ جائے گی۔ جی نہیں میں کل کا وعدہ نہیں کر سکتا ہاں پرسوں ضرور دے دوں گا انشاء اللہ۔“ وہ فارغ ہوئے آیا تو پوچھے بغیر نہ رہ سکی۔

”کون تھا فون پر؟ کون سی رقم کا تقاضا کر رہا تھا؟ آپ نے تو کبھی کسی سے قرض نہیں لیا۔“

”لایا نہیں مگر دے کر پھنس گیا ہوں۔“

”کیا مطلب؟“ وہ حیران تھی قرض مانگنے والے کیا اب اتنا پریشور ڈالتے ہیں کہ بندے کا رنگ ہی فق ہو جائے۔

”یار! وہ فاروقی صاحب ہیں ناں آفس میں انہوں نے پچھلے ہفتے مجھ سے دو ہزار یہ کہہ کر مانگے کہ دو ہی دن میں لوٹا دوں گا۔ مجھے تنخواہ اسی دن ملی تھی اور تم جانتی ہو میرا ذاتی خرچہ کچھ خاص نہیں ہے۔ جہاں کمیشن ڈالی ہے وہاں پانچ تاریخ تک پیسے پہنچانے ہوتے ہیں اس لیے آزر اور ہمدردی انہیں دو ہزار دے دیے۔ اب ابھر کمیشن والے نے شور مچایا ہوا ہے۔ آج آٹھ تاریخ ہے حالانکہ میں ہمیشہ پہلی یا دوسری تاریخ کو ہی

تین ہزار وہاں پہنچا دیتا ہوں۔ وہ فاروقی صاحب ایسے غائب ہوئے ہیں یہ تو مجھے بعد میں پتا چلا وہ ہفتے کی چھٹی پر ہیں۔ دیکھو اب شاید کل یا پرسوں پیسے واپس آئیں تو میری جان چھٹے ورنہ تو اس خطبہ فون کر کے نہ گھر میں چین لینے دینا ہے نہ اس سے سکون سے کام کرنے دے گا۔“ وہ بے دلی سے چکھتے ہوئے بولا۔

”آپ کیوں فضول کی ٹینشن لیتے ہیں وہ دن مزید اس کے فون سننے پر نہیں گے۔ آپ مجھ سے لیں پیسے، دو ہزار تو میں بھی دے سکتی ہوں مجھے ملے ہیں۔ جب فاروق صاحب آپ کو دس سو روپے مجھے لوٹا دیجئے گا، کم از کم اس کمیشن والے سے آج ہی چھڑالیں۔“

”اب تک کہتی ہو میں نے کبھی کسی سے رقم اٹھا کر لیا ہی نہیں، کوئی تقاضا کرے تو عجیب سی احساس ہوتا ہے جیسے میں کسی کی رقم کھا گیا ہوں خدا نخواستہ۔“ وہ بات کرتے کرتے کسی خیال پر جا پڑی۔ ”ارے کیسے آپ تم مجھے تو اپنا قرض لوٹا جا رہا ہے۔“

”نہیں بھی، تو ب کریں۔“ وہ ہنسی۔



اتفاق ہے اگلے ہی روز اس کی فیصل آباد والی نازیہ اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ ان کے ہاں آئی۔

گئی۔ انعم اور احد تو بے حد خوش تھے کہ نازیہ ان ہی کے ہم عمر تھی اور ان میں دو سنی تھی۔ خود ششہ کے بھی اپنی اس نند سے اتنا خاص دوستانہ تھے کیونکہ صائمہ اور شازیہ اچھا خاصا فرق ہونے کی وجہ سے احترام والہ اور ورنہ تو تینوں میں ہی نندوں والی روایتی خوبیاں نہیں شکر ہے کہ اس بار اس نے شاپنگ میں ہر چیز کی گنی مقدار میں خریدی تھی۔ اس لیے باہر سے منگانا نہیں پڑا۔ گوشت مرغی تھی سب ہی والی نازیہ کے شوہر کے لحاظ میں اس نے دونوں پر تکلف کھانا پیش کیا حالانکہ وہ بیچاری منع ہی

کی کولڈ ڈرنکس فروٹ وغیرہ میں اس کے پاس کی کچی رقم بھی اڑنے لگی۔ اب وہ اپنی اندھا شاپنگ کرنے پر پچھتا رہی تھی۔

اگر ان ہی ڈھائی ہزار کے شمار میں اتنا خرچ کیا تھا تو کم وہی پاس رہنے دیتی۔ ”وہ خود کو گھر کئے لگی۔“ سے مانگتے ہوئے بھی ہچکچاہٹ ہو رہی تھی کہ وہ ان سے دیتے ہوئے بڑی فراخ دلی سے کہا تھا کہ ہفتہ دس دن نہ بھی دو گے تو کوئی بات نہیں مجھے اس خاص ضرورت نہیں۔“

”ہائیر“ انھیں ناں مجھے آپ سے بات کرنی ہے۔“ انعم کے بچہ لڑکے میں اس انعم کے ساتھ ہی سو تھے۔ قہر پینے کے بعد انصر انجے کے بید روم چلا آیا وہ ڈرائیونگ روم میں نازیہ اور اس کے شوہر کے کمرے میں گئے بعد کچن کا پھیلاوا سمیٹ کر سوئے۔ احد کو اٹھائے اندر آئی تو اسے آنکھیں موند گئیں۔

”صبح مجھے ایسی کیا ضروری بات ہے۔“ صبح کی ایک ٹیبلٹ چ رہا ہے۔“ صبح مجھے آفس بھی جانا ہے۔“ اس نے تکیہ پر سر رکھ لیا۔

”صبح جب آپ انھیں گئے میں کچن میں ناشتہ کرنے میں مصروف ہوں گی میں فارغ ہوں گی تو آپ اس پلے جائیں گے اور بعد میں یہ بات کر کے گا کوئی نہیں۔“

اس کے انداز پر وہ محتسب سا اٹھ بیٹھا۔ ”ہاں“ وہ صائمہ آیا نے پرسوں نازیہ اور ہماری دعوت کی اور نازیہ نے بھی اس سے اگلے روز واپسی کا ام بنا لیا ہے۔

”تو اس میں اتنا رازداری سے آدھی رات کو جگا مانے والی کون سی بات ہے یہ تو میں پہلے سے جانتا تھا۔“ وہ جھنجھلا تا ہوا پھر سے لیٹ گیا۔

”اوہو“ کبھی تو بات پوری سن لیا کریں۔ میرا کہنے کا یہ ہے کہ نازیہ پہلی بار ہمارے گھر رہنے آئی ہے، آپ اسے اور بچوں کو تحائف دینے ہوں گے۔ میں

سوچ رہی ہوں صائمہ آپا کے ہاں سے ہی بازار چلی جاؤں گی۔ ان کے گھر سے مارکیٹ قریب ہے، بچوں کے کپڑوں کی اچھی ورائٹی ملتی ہے وہاں۔“

”کیا یہ سب اہتمام ضروری ہے؟“ اس نے پوچھا۔ ”لو بھلا، کیوں ضروری نہیں ہے۔“ وہ ہرمان لگی۔ جب وہ لاہور رہنے آئی تھی اور واپسی پر ہر بار ہی اپنے اس کے اور بچوں کے لیے کپڑے فروٹ اور مٹھائیاں وغیرہ لے کر جاتی تھی تو تب کبھی اس نے ان سب کا ”ضروری ہونا دریافت نہیں کیا تھا۔“

”ضروری کیوں نہیں۔ آپ سے کہہ رہی تھی، ہمیشہ صبح آئی شام کو واپس گئی ہوں مگر اب اتنے رکھے میرے بھائی کا گھر بھی لاہور میں ہے، میرا میکہ ہے یہ میں تو یہاں ہی رہوں گی باقی سب سے صرف ملنے کے لیے جاؤں گی۔ تو جب اس نے آپ کو یہ عزت دی ہے کہ ماں باپ کا درجہ اور مقام آپ کو اور اس گھر کو دیا ہے تو ہمیں بھی اسے میکے کا مان دینا چاہیے پھر وہ آپ کی چھوٹی بہن ہے۔“

”اچھا اچھا۔۔۔ آگے کہو اب۔۔۔ مسئلہ کیا ہے۔“ وہ جمائیاں روک رہا تھا۔

”اس دن آپ کے لیے کائن کے جو دو سوٹ لائی تھی مگر بے شید آپ کو پسند نہیں آیا تھا وہ بھائی جان کو دے دیتے ہیں۔ میرے پاس جارحٹ کا ایک پرنٹڈ سوٹ رکھتا ہے وہ نازیہ کو دے دوں گی صرف دو پینڈ خریدنا ہو گا۔ ہاں البتہ بچوں کے کپڑے تو بازار سے ہی خریدنا ہوں گے اس کے لیے میرا پروگرام ہے پرسوں صائمہ آپا کے ہاں سے نازیہ کو ساتھ لے جا کر خرید لوں گی۔“

”میں نے مسئلہ پوچھا ہے ششہ! تم ”حل“ بتا رہی ہو۔ وہ ناگواری سے بولا تو وہ اصل مدعا یہ آئی گئی۔

”اور اصل انصر! میرے پاس پیسے بالکل بھی نہیں ہیں۔ بس یہی کوئی ڈیڑھ پونے دو سو ہوں گے۔“ ”کیا! اس کی نیند بھگ سے اڑ گئی۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ ششہ نے اسے۔۔۔ مینے کے ختم ہونے سے پہلے تنخواہ ختم ہونے کی خبر سنائی ہو۔ ”تم ہوش میں تو ہو“ ابھی آج بارہ تاریخ ہے اور تم ہاتھ خالی کر کے بیٹھی

”وہ دراصل مجھے اپنی اور بچوں کی شراپنگ کرنا تھی۔ میرے پیسے آپ نے اوہار لے لیے تو میں نے گھر کے خرچے سے یہ سوچ کر استعمال کر لیے کہ آج یا کل آپ پیسے واپس کر ہی دیں، وہ میں خرچے میں ڈال لوں گی۔ یوں بھی عام طور پر گھر میں پیسوں کی ضرورت اتنی پڑتی بھی نہیں۔ تمام ضرورت کی چیزیں میں پہلے سے خرید کے رکھ لیتی ہوں حتیٰ کہ سردرد کی گولیاں اور کھانسی کا شربت بھی۔ یہ تو اتفاق ہے کہ بس آپ کسی طرح وہ فاروقی صاحب سے پیسے لے کر آئیں کل۔“

”اب کیا گرون دیوچ لوں اس کی۔ نینٹو دیا دوں، چھاتی پہ چڑھ کے بیٹھ جاؤں۔ روزمانگتا ہوں روز نہیں کر ٹال دیتا ہے۔ بزرگ آدمی ہے لحاظ تو کرنا ہی پڑتا ہے ورنہ اس کی مسکراہٹ ایسا لگتا ہے کہ رہا ہو۔ کیسا بھنسنے؟“

”پھر کسی اور سے نہی لے کر۔“
 ”میں کسی سے قرض نہیں لیتا۔ تم جانتی ہو، جانے اس دن کیسے تم سے لے لیا۔“
 ”میں نے آپ کو قرض نہیں دیا تھا انصر۔“ وہ دکھ سے بولی۔ ”ہمارے رشتے کا ہی وہ بیان کر لیں۔ کیا اس رشتے میں قرض اور اوہار کی گنجائش نکلتی ہے؟“
 ”قرض ہی تو تھا جو وصولی کے لیے آدھی رات کو جگا کر تقاضا کر رہی ہو۔“ اس نے کروٹ پیل لی اور وہ کتنی ہی دیر بیٹھی پچھتاہی رہی، جانے رقم دینے پر یا واپس مانگنے کی ہمت کرنے پر یا پھر نازیہ سے ذکر کروینے پر کہ وہ کل اس کی پسند سے ہی بچوں کے لیے شاپنگ کر لے گی۔ اب بچوں کے دو مارل قیمت والے ریڈی میڈ سونس کے لیے بھی چھ سات سو تو چاہیے تھے۔
 صبح وہ چاہتے ہوئے بھی ہمت نہ کر پائی انصر کو یاد دہانی کرانے کی۔ ہاں منتظر ہی رہی شاید وہ آفس جانے سے پہلے خود ہی کوئی تسلی آمیز فقرہ کہہ دے گا۔ ”فکر مت کرو، آج کسی طرح تمہارے پیسے دلہن لے آؤں گا۔“ مگر وہ تو یوں چپ تھا کہ نازیہ نے بھی اس کی خاموشی نوٹ کی، ششہ نے نیند پوری نہ ہونے کا بہانہ

الچٹا ٹائم میں اس نے ڈرتے ڈرتے فون کیا۔

"ہیلو۔" انصر کی خشک آواز نے اس کی رائی
ہمت بھی کھینچ لی۔
"ہیلو کیسے ہیں آپ، صبح طبیعت ٹھیک نہیں
آپ کی۔ میں نے سوچا پتا کر لوں۔"
"طبیعت تو ٹھیک ہے، بس کام کا بوجھ ہے۔"
نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔ چند اور لوہرا دھر کر اسی
کرنے کے بعد وہ بڑی جرات سے صرف یہ پوچھ
"وہ..... فانی فاروقی صاحب آئے ہیں ان
جوایا؟" ایک طویل خاموشی و قہقارے پریشان کر رہا تھا۔
"آئے ہیں" اور فکر مت کرو..... میں بھی کہہ
جاؤں گا۔ ہنگامہ نہیں جاتا تمہارے دو ہزار روپے
اس کے کھٹ سے ریسیور رکھ دیئے سے وہ ہکا

♥ ♥ ♥ ♥

پو پیلچی تھی۔

”نازیہ اور بچے کہاں ہیں؟“ اس کے سوال کا،
وہ بے اختیار ہنستے بغیر وہ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے

”بھائی جان اسے کوئی بچوں کو مینار پاکستان والے لیے لے گئے ہیں، آتے ہی بچوں کے گھر آجائیں۔“
 نہیں بغیر اطلاع کے کبھی اتنی دیر گھر سے باہر
 رہے میں اس قدر پریشان ہوتی رہی۔ کوئی کام تھا
 از کم فون کر کے تاخیر سے آنے کا بتا ہی دیتے۔

لوٹو، گا۔ ”وہ دھڑاڑا شستہ سہم کر بولی۔

”پلیز انصر! خدا کی قسم میرے فون کھینچنے کا
نہیں تھا، ٹھیک ہے مجھے پیسے چاہئیں مگر یہ
دیکھیں کہ آج ہی ملنا کتنا ضروری ہے۔ کل کا ہی
تھا پھر نازیرواپس۔“

ہاں وہ واپس چلی جاتی اور تمہارے نمبر بڑھنے سے
جاتے۔ تمہاری واہ واہ کیسے ہوتی اپنی بڑی رہتی ہے
۔ ”اس نے ٹائی کھینچ کے نکالی۔ ”ہمیشہ سیسہ ہمیشہ
ی کی ساری تنخواہ تمہیں پکڑائی۔ ایک پیسے کا
اب نہیں لیا کبھی سیاہ کرو سفید کرو ہر چیز کا مختار
بولو آج تک کبھی حساب مانگا تم سے کہ میری
برسوں کی کمائی میں سے کیا بچایا گیا جوڑا۔ ”اس
ہوتے اتار کے کمرے کے دائیں بائیں پھینکے
گھبرا کے کھڑی ہو گئی۔

انصر ایہ کیا کہہ رہے ہیں آپ! میں جانتی ہوں
میں نے ہمیشہ سے گھر کے تمام اختیارات مجھے دے
دیں مگر اتنے انجان تو آپ بھی نہیں کہ جانتے نہ
ہیں گھر کے خرچ اور آپ کی خواہ کا کیا تناسب بنتا
ہے۔ ایسے حالات میں کچھ بچانے یا جوڑنے کا سوال ہی
نہیں پیدا ہوتا ہے۔“

”میں سوائل کر بھی نہیں رہا۔ میں صرف یہ بتا رہا ہوں کہ میں ہوں، میں ہوں، میں ہوں۔“

ہی کیا ہے میرا۔ تم نے جو پکایا کھا لیا۔ جو پکایا
 لیا۔ اور تم تم پہلی بار یہ دو ہزار لیا کھا لیں میرے
 ہی چڑھ گئیں۔ یہ یہ دو ہزار۔ اس نے جیب سے
 دو ہزار کے نوٹ نکال کر لرائے۔ ”میری غلطی
 ہو گئی۔“ تم نے ہر مشکل وقت میں یہ رقم تم سے
 لے لیا۔ تم تو چاہتی تھی تمہیں کہ کسی طرح مجھے کمتری
 ماس دلا سکوں، مجھ سے اپنی کمائی کی دھولس جما سکوں۔
 کو تقاضا دن کو آفس پہنچے ہوئے منہ سو جا ہوا، پھر
 فون کر لیا۔ انہی دو ہزار کے لیے ناں۔ یہ لو اپنے
 ”اس نے نوٹ حقیقتاً“ اس کے منہ پہ دے

ان پہلی بار زندگی میں پہلی بار اپنے ایک جاننے سے اشد ضرورت اور مجبوری کا رونا روکے یہ کہے ہیں۔ وہ فاروقی تو پھر سے چھٹی رہ چلا گیا ہے۔

اب جب تک وہ آکر مجھے میرے پیسے نہیں لوٹاتا ہو سکتا ہے یہ شخص بھی اسی طرح مجھ سے بار بار تقاضہ کرے مگر وہ اس ذلت سے تو بہتر ہو گا کہ میری ہی بیوی میری مشکل کو نہ سمجھتے ہوئے میری جان کو آجائے۔ غیروں کی بات پھر بھی برواشت ہو جاتی ہے لیکن تم سے آئندہ ایک پیسے کا بھی احسان نہیں لوں گا۔ تھوکتا ہوں تمہارے پیسے پر۔" وہ غصے سے باہر نکل گیا اور شستہ اپنے پیروں میں بڑے ان مڑے بڑے ٹوٹوں کو ڈبڈباتی آنکھوں سے دیکھ گئی۔

”اوپو! آپ کہتی تھیں کہ مرد کی حق حلال کی کمائی چاہے کتنی ہی کم کیوں نہ ہو، بابرکت ہوتی ہے اور عورت کی کمائی چاہے حلال کی ہی کیوں نہ ہو، کبھی پوری نہیں پڑتی مگر اوہ۔۔۔۔۔ آپ نے یہ نہیں بتایا تھا کہ عورت کی کمائی اتنی بے وقعت ہوتی ہے کہ۔۔۔۔۔ اسے پیروں تلے روند کے اس پر تھوکا جاتا ہے۔“ وہ گھٹنوں کے بل گر کے سسکنے لگی اور نوٹ اٹھا کر اپنی برتن آکھوں سے لگا لے۔

پی بری اہوں سے لگا ہے۔
 ”نصر! خدا گواہ ہے، آپ کی متخواہ میں جب کبھی
 اضافہ ہوا ہے چاہے پچاس روپے کا ہی ہو میں نے
 نکلانے کے نفل ادا کیے ہیں اور صدقہ دیا ہے اس کے
 علاوہ ہر مہینے پیسے پکڑتے ہی کلمہ شکر ادا کیا ہے۔ اتنی
 عقیدت سے وہ روپے تھامے ہیں جیسے آپ نے کوئی
 مقدس تحفہ دے دیا ہو۔ ایک امانت کی طرح پائی پائی
 خرچ کی ہے۔ کبھی ایک روپیہ بھی میری یا بچوں کی
 لاپرواہی سے ادھر ادھر ہو گیا ہو تو گنہگار ہوئی ہوں۔
 ہر بار خرچہ کرتے ہوئے آپ کی محنت سے بے سپنے
 اور ہستہن سے چور جسم کا خیال کیا ہے، کتنی قدر کی ہے
 آپ کی کہانی کی اور آپ۔۔۔ آپ کے نزدیک میری
 کہانی کی اتنی بھی وقعت نہیں، کیسے بے دردی سے
 پھینک کے چلے گئے۔ کیا میری محنت، محنت نہیں۔“ وہ
 نوٹ کبھی آنکھوں، کبھی لبوں سے لگاتی جھلکتے پتے دل
 سے سوال کرتی رہی۔